8

عورتیں، ذات پات اور اصلاحات

4824CH08

کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ دو سو سال پہلے بچے کس طرح رہتے سہتے تھے؟ آج سماج کے درمیانی طبقوں کے خاندانوں کی اکثر لڑکیاں اسکول جاتی ہیں اور اکثر تو وہ لڑکوں کے ساتھ پڑھتی بھی ہیں۔ بڑے ہو کر بہت سی لڑکیاں کالج اور یونیورسٹی بھی جاتی ہیں اور اس کے بعد نوکری بھی کرتی ہیں۔ آج ان کو شادی سے پہلے بالغ ہونا قانوناً ضروری ہے اور قانون کے مطابق وہ جس سے چاہیں شادی کر سکتی ہیں چاہے وہ کسی ذات یا کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ آج بیوہ عورتیں بھی شادی کر سکتی ہیں۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی ووٹ دے سکتی ہیں اور الیکشن میں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ حقوق عملی طور پر سب کو نہیں مل پاتے۔ غریب لوگوں کو تعلیم کے مواقع نہیں مل پاتے یا بہت کم ملتے ہیں۔ اکثر خاندانوں میں عورتیں اپنی مرضی سے اپنے شوہروں کا انتخاب نہیں کر سکتیں۔

شکل 1 – ستی، بالتھازر سالون کی بنائی پینٹنگ، *1813*

یہ ستی کی ان بہت سی تصاویر میں سے ایک ہے جو ہندوستان آنے والے یوروپین مصوروں نے بنائی ہیں۔ ستی کی رسم کو مشرق کی بربریت کی مثال سمجھا جاتا ہے۔

دو سو سال پہلے حالات اور معاملات بہت مختلف تھے۔ اکثر بچوں کی کم عمری میں شادی کر دی جاتی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک سے زائد شادیاں کر سکتے تھے۔ ملک کے کچھ حصوں میں ان بیوہ عورتوں کی بڑی تعریف و تحسین ہوتی تھی جو اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ خود بھی

جل جاتی تھیں۔ جو عورتیں اس طرح مرتی تھیں چاہے وہ اپنی مرضی سے یا بنا مرضی کے ان کو ''ستی'' کہا جاتا تھا۔ ستی کے معنی ہیں ''نیکوکار عورتیں''۔ عورتوں کے لیے جائداد کے حقوق بھی محدود تھے۔ اس کے علاوہ حقیقتاً عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی آسانی میسر نہ تھی۔ ملک کے بہت سے حصوں میں لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اگر عورت پڑھ لکھ لے گی تو بیوہ ہو جائے گی۔

عورتوں اور مردوں کے درمیان امتیازات برتنا ہی سماج میں پھیلی اکیلی برائی نہ تھی۔ بہت سے علاقوں میں لوگ ذات پات کی بنیاد پر بٹے ہوئے تھے۔ برہمن اور چھتریہ خود کو ''اعلیٰ ذات'' والا سمجھتے تھے۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں جیسے تاجروں اور ساہوکاروں (جنھیں اکثر ویش کہا جاتا تھا) کا مرتبہ تھا۔ اس کے بعد کسانوں اور کاریگروں جیسے کپڑا بُننے والوں اور کُمہاروں کا نمبر آتا تھا (انھیں شودر کہا جاتا تھا)۔ سب سے پست طبقہ ان لوگوں کا تھا جو گاؤں اور شہروں کی صفائی کا کام کرتے تھے یا کوئی ایسا کام کرتے تھے جسے اونچی ذات والے ''گندا کام'' سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کو ذات کے اعتبار سے کوئی مرتبہ حاصل نہ تھا۔ اعلیٰ ذات کے لوگ ان میں سے بہت سے گروپوں کو ''اچھوت'' سمجھتے تھے۔ ان اچھوتوں کو مندروں میں جانے کی، اُن کنوؤں سے پانی نکالنے کی جن کو اعلیٰ ذات کے لوگ استعمال کرتے ہوں یا ان تالابوں میں نہانے کی جہاں اعلیٰ ذات کے لوگ نہاتے ہوں، بالکل اجازت نہ تھی۔ ان کو کمتر مخلوق سمجھا جاتا تھا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے طور طریقے اور نظریات میں آہستہ آہستہ تبدیلی آئی۔ آیئے دیکھیں کہ ایسا کیسے ہوا۔

تبدیلی لانے کی کوششیں

انیسویں صدی کی ابتدا سے ہی نمایاں طور پر واقع ہونے والے سماجی رسم و رواج اور طور طریقوں پر بحث و مباحثے شروع ہو گئے تھے۔ مواصلات کی نئی نئی شکلوں کی ترقی اس کا ایک اہم سبب تھی۔ پہلی بار کتابیں، اخبارات، رسالے اور کتابچے وغیرہ چھپے۔ یہ سب چیزیں ان قلمی کتابوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ سستی اور قابل رسائی تھیں جن کے بارے میں آپ ساتویں جماعت میں پڑھ چکے ہیں۔ اس طرح ان کو عام لوگ بھی لکھ پڑھ سکتے تھے اور اپنی

سرگرمی

چھاپہ خانہ سے پہلے کے اس دور میں جب کتابیں، اخبارات اور کتابچے وغیرہ فوری طور پر دستیاب نہیں ہوتے تھے تو کیا آپ ایسے طور طریقوں کو سوچ سکتے ہیں جن کے تحت سماجی رسم و رواج پر بحث کی جا سکتی ہو۔

زبان میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کر سکتے تھے۔ اب نئے شہروں میں ہر قسم کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی مسائل پر مرد (اور کبھی کبھی عورتیں بھی) بحث کر سکتے تھے۔ یہ بحث ومباحثے عام لوگوں تک پہنچتے تھے اور ان کا تعلق سماجی تبدیلیوں کی تحریکات سے جُڑ جاتا تھا۔

شکل 2 – راجہ رام موہن رائے،
ریمبرانڈ پیلے کی بنائی پینٹنگ، *1833*

ہندوستانی مصلحین اور اصلاحی گروہ اکثر ایسی بحثیں شروع کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک مصلح یا سماج سدھارک راجہ رام موہن رائے (1833-1772) تھے۔ انھوں نے ایک اصلاحی انجمن کلکتہ میں قائم کی تھی جو برہمو سبھا کے نام سے مشہور ہوئی (بعد میں اسے برہمو سماج کہا گیا)۔ راجہ رام موہن رائے جیسے لوگوں کو اسی لیے مصلح کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ سماج میں تبدیلیاں ضروری ہیں اور سماجی ناانصافیوں سے چھٹکارا پانے کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں ان تبدیلیوں کو یقینی بنانے کا سب سے بہترین طریقہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ پرانی روش چھوڑ دیں اور نیا طرز زندگی اختیار کریں۔

راجہ رام موہن رائے ملک میں مغربی تعلیم پھیلانا چاہتے تھے اور عورتوں کی آزادی اور مساوات کے حامی تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کس طرح عورتوں کو گھریلو کام کاج کی ذمہ داری برداشت کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، کس طرح گھر اور باورچی خانے میں ان کو محدود کر دیا جاتا ہے اور باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ جس کے نتیجے میں وہ تعلیم حاصل نہیں کر پاتیں۔

بیواؤں کی زندگی میں تبدیلی

رام موہن رائے خاص طور پر ان مشکلات سے بہت متاثر تھے جو بیواؤں کو اپنی زندگی میں سہنی پڑتی تھیں۔ انھوں نے ستی رسم کے خلاف ایک مہم چلائی۔ رام موہن رائے سنسکرت، فارسی اور کئی دوسری ہندوستانی اور یوروپی زبانوں کے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ بیوہ عورت کو جلانے کی رسم قدیم کتابوں میں کہیں نہیں ملتی۔ جیسا کہ آپ ساتویں باب میں پڑھ چکے ہیں کہ انیسویں صدی کے شروع میں بہت سے برطانوی عہدیداروں نے ہندوستانی رسوم اور روایات پر تنقید شروع کر دی تھی۔ وہ راجہ رام موہن رائے کی باتوں کو سننے کے بہت شائق تھے کیوں کہ وہ ایک صاحب علم کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے۔ 1829 میں ستی پر پابندی لگادی گئی۔

راجہ رام موہن رائے نے جس حکمت عملی کو اختیار کیا تھا اسے بعد کے مصلحین نے بھی

شکل 3 – ہک جھولا تہوار
اس مشہور تہوار میں بھگت ایک خاص قسم کے ابتلا یا اذیت کو برداشت کرتے تھے اور اس کو عبادت سمجھتے تھے۔ اپنی کھال میں ہک ڈال کر خود کو ایک پہیے پر جھلاتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب یوروپین عہدیداروں نے ہندوستانی رسم و رواج کو وحشیانہ بتانا شروع کیا تھا تو اس وقت اس رسم پر بھی سخت اعتراض کیے گئے تھے۔

اختیار کیا۔ جب کبھی وہ کسی ایسی رسم کو چیلنج کرتے جو نقصان دہ نظر آتی تو وہ قدیم مقدس کتابوں میں سے کوئی ایسا جملہ یا اشلوک نکال لاتے جو ان کے نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہو۔ تب وہ یہ بات کہتے کہ یہ موجودہ عمل یا رسم قدیم روایات کے خلاف ہے۔

مثال کے طور پر ایک بہت مشہور مصلح ایشور چندر ودیا ساگر نے بھی یہ بتانے کے لیے قدیم کتابوں کا حوالہ دیا کہ عورتیں دوسری شادی کرسکتی ہیں۔ ان کی تجویز کو برطانوی عہدیداروں نے اختیار کرلیا اور 1856 میں ایک قانون بنایا گیا جس کی رو سے بیوائیں دوسری شادی کرسکتی تھیں۔ جو لوگ بیواؤں کی دوسری شادی کے خلاف تھے انھوں نے ودیا ساگر کی مخالفت کی اور ان کا بائیکاٹ بھی کیا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر تک بیواؤں کی دوسری شادی کی تحریک ملک کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ مدراس پریزیڈنسی کے تیلگو زبان کے علاقوں میں ویرا سالنگم پنتولو نے بیوہ عورتوں کی شادی کے لیے ایک انجمن بنائی۔ اسی زمانے میں نوجوان دانشور اور مصلحین نے بمبئی میں اس مقصد کے لیے کام کرنے کا عہد لیا۔ شمال میں دیانند سرسوتی نے آریہ سماج نامی ایک ایسوسی ایشن بنائی اور بیواؤں کی دوسری شادی کی حمایت کی۔

بہرحال ان بیواؤں کی تعداد جنھوں نے دوسری شادی کی کم ہی رہی۔ جنھوں نے شادی کی تھی ان کو سماج میں مقبولیت نہیں ملی اور قدامت پسندوں نے نئے قانون کی مخالفت کی۔

ماخذ 1

''ہم پہلے ان کو چتا سے باندھ دیتے ہیں''

رام موہن رائے نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے بہت سے پمفلٹ (کتابچہ) چھپوائے۔ ان میں سے کچھ پمفلٹ کسی روایتی عمل کے حامی اور طرفدار اور مخالف کے درمیان مکالموں کی شکل میں ہوتے تھے۔ ستی کے اوپر ایسا ہی ایک ڈائیلاگ ذیل میں درج ہے:

ستی کا طرفدار:

عورتیں فطرتاً ناقص العقل ہوتی ہیں ان میں قوت فیصلہ کی کمی ہے اور وہ اعتماد کے لائق بھی نہیں ہوتیں..... ان میں سے بہت سی عورتیں اپنے شوہر کے مرنے پر ان کے ساتھ ہی مر جانا چاہتی ہیں؛ لیکن وہ بھڑکتی آگ سے بچ کر نکل بھاگنے کی کوشش نہ کریں اس کے لیے ہم پہلے ان کو چتا سے باندھ دیتے ہیں۔

ستی کا مخالف:

کیا کبھی آپ نے ان کو ایسا مناسب موقع فراہم کیا کہ وہ اپنی فطری صلاحیت کا اظہار کرتیں؟ پھر تم کس بنا پر ان پر سمجھ بوجھ سے عاری ہونے کا الزام لگاتے ہو۔ اگر علم و دانش کی روشنی عطا کرنے کے بعد بھی کوئی شخص نہیں سمجھتا یا جو کچھ اس کو سکھایا گیا اس کو محفوظ نہیں رکھتا تو تم اس کو ناقص کہہ سکتے ہو۔ لیکن اگر تم عورتوں کو تعلیم سے آراستہ ہی نہ کرو تو تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ناقص ہیں۔

لڑکیاں اسکول جانے لگیں

بہت سے مصلحین نے یہ محسوس کیا تھا کہ عورتوں کی حالت میں سدھار لانے کے لیے لڑکیوں کی تعلیم ضروری ہے۔

کلکتہ میں ودیا ساگر اور بمبئی میں بہت سے مصلحین نے لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے۔ جب انیسویں صدی کے وسط میں لڑکیوں کے لیے اسکول کھولے گئے تو بہت سے لوگ ان اسکولوں سے خائف بھی تھے۔ ان کو یہ ڈر تھا کہ اسکول لڑکیوں کو گھر سے دور کر دیں گے اور ان کی گھریلو ذمہ داریوں کے انجام دینے میں حائل ہوں گے۔ اس کے علاوہ، اسکول تک پہنچنے کے لیے لڑکیوں کو عوامی مقامات پر جانا پڑے گا۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس سے ان پر برے اثرات مرتب ہوں گے۔ ان کے خیال میں لڑکیوں کو عوامی مقامات سے دور رہنا چاہیے۔ اسی لیے انیسویں صدی میں تو تعلیم یافتہ عورتوں کو ان کے آزاد خیال والدین یا شوہروں نے گھر پر ہی پڑھایا۔ کبھی کبھی عورتوں نے خود ہی پڑھا۔

سرگرمی

یہ دلیل تو 175 سال پہلے دی گئی تھی۔ آپ ایسی مختلف دلیلیں لکھیے جو آپ نے عورتوں کی قدر و قیمت کے بارے میں اپنے ماحول میں کہیں سنی ہوں۔ اب خیالات میں کیا کیا تبدیلیاں آ گئی ہیں؟

شکل 4 – سوامی دیانند سرسوتی

دیانند سرسوتی نے 1875 میں آریہ سماج کی بنیاد ڈالی، اس تنظیم کا مقصد ہندو مت میں اصلاح لانا تھا۔

شکل 5 – ایشور چندر ودیا ساگر

آپ نے پچھلے سال اپنی کتاب سماجی اور سیاسی زندگی میں راش سندری دیوی کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا وہ یاد ہوگا؟ وہ ایک ایسی ہی خاتون تھیں جنھوں نے راتوں کو موم بتی کی لرزتی روشنی میں بہت خاموشی کے ساتھ لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔

اس صدی کے آخر میں آریہ سماج نے پنجاب میں اور جیوتی راؤ پھولے نے مہاراشٹر میں لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے۔

شمالی ہندوستان میں مسلم اشرافیہ کے گھروں میں عورتیں قرآن پڑھنا سیکھتی تھیں۔ ان کو گھروں پر عورتیں پڑھانے آتی تھیں۔ ممتاز علی جیسے اصلاح پسندوں نے قرآنی آیات کی ازسرِنو تفسیر کے ذریعے عورتوں کی تعلیم کے دلائل دیے۔ انیسویں صدی کے آخر میں عورتوں کی تعلیم کے موضوع پر اردو میں ناول بھی لکھے جانے لگے۔ دیگر باتوں کے علاوہ ان کا مقصد عورتوں کو مہذب اور امورِ خانہ داری کے بارے میں ایک ایسی زبان میں شوق دلانا تھا جسے وہ سمجھتی تھیں۔

عورتوں نے عورتوں کے بارے میں لکھنا شروع کیا

شکل 6 – ہندو مہیلا ودیالیہ کی طالبات، 1875
جب انیسویں صدی میں پہلی مرتبہ لڑکیوں کے لیے اسکول قائم ہوئے تو عام خیال یہ تھا کہ لڑکیوں کے لیے نصابِ تعلیم لڑکوں کے نصابِ تعلیم کے مقابلے آسان ہو۔ اس زمانے میں ہندو مہیلا ودیالیہ وہ پہلا ادارہ تھا جس نے لڑکیوں کو بھی وہی تعلیم دی جو لڑکوں کو دی جا رہی تھی۔

بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی مسلم خواتین جیسے بھوپال کی بیگمات نے عورتوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔ انھوں نے علی گڑھ میں لڑکیوں کے لیے ایک پرائمری اسکول قائم کیا۔ ایک دوسری اہم خاتون بیگم رقیہ سخاوت حسین تھیں جنھوں نے پٹنہ اور کلکتہ میں مسلم لڑکیوں کے لیے اسکول شروع کیے۔ وہ قدامت پسند خیالات کی کٹر مخالف تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ہر فرقے کے مذہبی رہنماؤں نے عورتوں کو کمتر مقام دیا ہے۔

1880 کی دہائی آتے آتے ہندوستانی عورتیں یونیورسٹیوں میں پہنچنے لگیں۔ ان میں کچھ ڈاکٹر بنیں اور کچھ ٹیچر۔ بہت سی عورتوں نے سماج میں عورتوں کے مقام و مرتبہ پر لکھنا اور اپنے مضامین چھپوانا شروع کیے۔ تارابائی شنڈے جو پٹنہ کی ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور جن کی گھر پر تعلیم ہوئی تھی انھوں نے ”استری پرش

تــلــنــا'' (عورتوں اور مردوں کا موازنہ) نامی ایک کتاب شائع کی اور اس میں عورتوں اور مردوں کے درمیان سماجی امتیازات پر تنقید کی۔

سنسکرت کی ایک اسکالر پنڈتا راما بائی کا نظریہ تھا کہ ہندومت کا رویہ عورتوں کے لیے جابرانہ ہے۔ انھوں نے اعلیٰ ذات کی ہندو عورتوں کی تکلیف دہ حالت پر ایک کتاب لکھی۔ انھوں نے پونا میں ایک بیوہ خانہ کھولا اور اس میں ان بیوہ عورتوں کو رکھا جن کے ساتھ سسرال والے بہت برا سلوک کرتے تھے۔ اس گھر میں بیوہ عورتوں کو کچھ ایسے کاموں کی ٹریننگ بھی دی جاتی تھی جس سے وہ خود اپنی کفالت کر سکیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان سب باتوں نے کٹر پنتھیوں کو ڈرا دیا۔ بہت سے قوم پرست ہندو یہ محسوس کرنے لگے کہ ہندو عورتیں مغربی طور طریقے اپنا رہی ہیں اور اس سے ہندو کلچر برباد ہو جائے گا اور ان کی خاندانی اقدار نابود ہو جائیں گیں۔ قدامت پسند مسلمان بھی ان تبدیلیوں سے پریشان تھے۔

شکل 7 – پنڈتا راما بائی

آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انیسویں صدی کے آخر تک خود خواتین اصلاح کے لیے بہت جوش و خروش سے کام کرنے لگیں تھیں۔ انھوں نے کتابیں لکھیں، مجلّے شائع کیے، اسکول اور ٹریننگ سینٹر قائم کیے اور عورتوں کی انجمنیں بنائیں۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی انھوں نے خواتین کے حق رائے دہی کے لیے قانون بنوائے، ان کی بہتر طبی دیکھ بھال اور اچھی تعلیم کے لیے سیاسی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ خواتین نے 1920 کی دہائی سے ہی قومی اور سماجی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ بیسویں صدی میں جواہر لعل نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے رہنماؤں نے عورتوں کی آزادی اور برابری کے مطالبات کی حمایت کی۔ قومی رہنماؤں نے وعدہ کیا کہ آزادی کے بعد عورتوں اور مردوں کو یکساں حق رائے دہی حاصل ہوگا۔ بہر حال انھوں نے عورتوں سے یہ درخواست کی کہ وہ آزادی ملنے تک انگریز مخالف جدوجہد میں حصہ لیں۔

ماخذ 2

عورت کا شوہر ایک بار مر گیا تو......

تارابائی شنڈے نے اپنی کتاب 'استری پرش تلنا' میں لکھا ہے:

کیا عورت کو اپنی زندگی اتنی پیاری نہیں جتنی آپ کو اپنی زندگی عزیز ہے؟ کیا عورتیں کسی اور چیز سے بنی ہیں؟ کیا وہ خاک سے، مٹی سے کسی چٹان سے یا زنگ آلود لوہے سے بنی ہیں اور آپ کی تخلیق خالص سونے سے ہوئی ہے؟...... آپ پوچھتے ہیں کہ میرا کیا مطلب ہے؟ میرا مطلب یہی ہے کہ اگر ایک عورت کا شوہر مر گیا تو اب دنیا میں اس کا مقدر کیا ہے؟ ایک حجام آتا ہے اور اس کی زلفیں اور سر کے بال کاٹ جاتا ہے، محض آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے...... وہ کسی کی شادی بیاہ میں نہیں جا سکتی، کسی ایسی تقریب میں نہیں جا سکتی جس میں شادی شدہ عورتیں جاتی ہوں۔ یہ ساری پابندیاں کیوں؟ کیوں کہ اس کا شوہر مر گیا ہے۔ وہ بدنصیب ہے۔ اس کی پیشانی پر اس کا پھوٹا ہوا مقدر لکھا ہے۔ اس کا چہرہ نہ دیکھا جائے کیوں کہ وہ منحوس ہے۔

تارابائی شنڈے 'استری پرش تلنا'

2019-20

چھوٹی عمر میں شادی کے خلاف قانون

عورتوں کی تنظیمیں بڑھ گئیں اور ان موضوعات پر خوب لکھا جانے لگا تو اصلاحات نے بھی زور پکڑا۔ لوگوں نے ایک اور پختہ رسم۔کم عمری میں شادی۔کو چیلنج کیا۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی(Central Legislative Assembly) میں بہت سے ایسے ہندوستانی ممبر تھے جنھوں نے کم عمری میں شادی روکنے کے لیے قانون بنانے میں بڑی جدوجہد کی۔ 1929 میں ''کم عمری شادی مخالف قانون'' (Child Marriage Restraint Act) پاس ہوا تو کوئی بحث اور مخالفت نہیں ہوئی جو اس سے پہلے دیکھنے میں آئی تھی۔ اس قانون کے تحت 18 سال سے کم عمر کے لڑکے اور 16 سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ بعد میں یہ عمر بڑھا کر بالترتیب 21 سال اور 18 سال کر دی گئی۔

شکل 8 – آٹھ سال کی دلہن

یہ بیسویں صدی کی شروعات کی ایک دلہن کی تصویر ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں آج بھی ایسی 20 فی صد سے زیادہ لڑکیوں کی شادی ہوجاتی ہے جن کی عمر 18 سال سے کم ہوتی ہے؟

ذات پات اور سماجی اصلاح

ہم نے جن سماجی مصلحین کا ذکر کیا انھوں نے ذات پات کی نابرابریوں پر بھی تنقید کی ہے۔ رام موہن رائے نے ایک قدیم بودھ متن کا ترجمہ کیا ہے جو ذات پات کے خلاف تھا۔ پرارتھنا سماج نے بھکتی روایت کو قبول کیا۔ بھکتی روایت تمام ذاتوں کی روحانی برابری پر یقین رکھتی تھی۔ 1840 میں ذات پات کے خاتمہ کے لیے بمبئی میں پرم ہنس منڈلی قائم کی گئی۔ ان مصلحین اور اصلاحی تنظیموں کے ارکان میں بہت سے اعلیٰ ذات کے لوگ تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ یہ مصلحین خفیہ جلسوں میں کچھ ذاتوں کے ساتھ کھان پان اور چھوا چھوت سے متعلق ممنوعات کی خلاف ورزی بھی کرتے اور ان کی کوشش یہ ہوتی کہ وہ اپنی زندگیوں میں ان تعصّبات سے نجات پالیں جو ذات پات کے حوالے سے سماج میں پھیلے ہوئے ہیں۔

کچھ اور بھی ایسے لوگ تھے جنھوں نے ذات پات پر مبنی سماجی نظام کی ناانصافیوں پر سوال اٹھائے۔ انیسویں صدی کے دوران عیسائی مبلغین نے قبائلی اور ''نچلی'' ذات کے بچوں کے لیے اسکول قائم کیے۔ ان بچوں کو ایسے ذرائع نصیب ہوگئے کہ انھوں نے بدلتی دنیا میں اپنے لیے آگے بڑھنے کی راہ بنالی۔

اسی زمانے میں غریب لوگ گاؤں چھوڑ کر کام کی تلاش میں شہروں کی طرف آنا شروع ہوئے۔ شہروں میں نئے نئے کام شروع ہو رہے تھے۔ نئی نئی فیکٹریاں کھل رہی تھیں۔ میونسپلٹیوں میں بھی نوکریاں مل جاتی تھیں۔ شہروں کی توسیع کے بارے میں آپ چھٹے باب میں پڑھ چکے ہیں۔ اس سے مزدوروں کی مانگ میں اضافہ ہوا۔ نالیاں کھدیں، سڑکیں بنائی گئیں، مکانات کی تعمیر ہوئی اور شہروں کو صاف رکھنے کا کام بھی کیا گیا۔ ان سب کاموں کے لیے قلیوں، کھدائی مزدوروں، ڈھونے والے مزدوروں، اینٹ بچھانے والوں، نالی صاف کرنے والوں، جھاڑو دینے والوں، کمھاروں اور رکشہ چلانے والوں کی ضرورت پڑی۔ یہ مزدور کہاں سے حاصل ہوئے؟ گاؤں اور چھوٹے شہروں کے غریب لوگ جن میں بیشتر نچلی ذاتوں کے تھے ان بڑے شہروں کی طرف ہجرت کرنے لگے جہاں ایسے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ کچھ لوگ آسام، ماریشس، ٹرینی داد اور انڈونیشیا کے باغانوں میں کام کرنے چلے گئے۔ نئی جگہوں پر کام بہت مشکل تھا لیکن نچلی ذاتوں کے غریب لوگوں نے اعلیٰ ذات کے ان

شکل 9 – انیسویں صدی میں قلیوں کے جہاز کا ایک منظر

قلیوں کے اس جہاز کا نام جان ایلن تھا۔ اس سے بہت سے مزدور ماریشس پہنچے جہاں انھوں نے بہت سے مختلف النوع کام کیے۔ ان میں سے اکثر مزدور نچلی ذاتوں کے تھے۔

جوتے کون بناتا تھا؟

روایتی طور پر چمڑے کا کام کرنے والوں کو نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ مردہ جانوروں کی کھال کا کام کرتے تھے اور کھالوں کو گندا سمجھا جاتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران فوجوں کے لیے جوتوں کی بڑی مانگ ہوئی۔ چمڑے کا کام کرنے والی ذات کے خلاف بے جا تعصب کا مطلب یہی تھا کہ صرف چمڑے کا کام کرنے والے اور جوتا بنانے والے ہی فوج کے لیے جوتا بنانے کو تیار ہوئے۔ اس طرح انھوں نے اونچے داموں پر کام کیا اور بڑا فائدہ کمایا۔

شکل 10 – انیسویں صدی کے آندھرا پردیش کے مادیگا لوگ جوتا بناتے ہوئے

مادیگا موجودہ آندھرا پردیش کی ایک اچھوت ذات تھی۔ یہ لوگ کھالیں صاف کرنے اور دباغت دے کر ان کو سینے اور سینڈل بنانے میں ماہر تھے۔

زمینداروں کے جبر واستحصال اور ذلت سے بچنے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا جس کا وہ ہر روز شکار ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ اور بھی کام تھے مثلاً فوج میں کام کے مواقع۔ مَہار (Mahar) لوگوں کو بھی اچھوت سمجھا جاتا تھا۔ ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو مَہار رجیمنٹ میں کام ملا۔ دلت تحریک کے رہنما بھیم راؤ امبیڈکر کے والد ایک فوجی اسکول میں پڑھاتے تھے۔

شکل 11 – گجرات کے دبُلا لوگ بازار میں آم لے جاتے ہوئے

دبلا لوگ اعلیٰ ذات کے زمینداروں کے لیے کام کرتے تھے، ان کے لیے کھیتی باڑی کرتے اور ان کی گھر گرہستی کے مختلف قسم کے ذلت آمیز کام انجام دیتے تھے۔

انصاف اور مساوات کے مطالبے

انیسویں صدی کے نصف آخر تک آتے آتے، ''غیر برہمن'' ذاتوں میں سے ہی بعض لوگوں نے رفتہ رفتہ ذاتی بھید بھاؤ کے خلاف تحریک شروع کی اور سماجی برابری اور انصاف کی مانگ کی۔

وسطی ہندوستان کی ستنامی تحریک کی ابتدا گھاسی داس نے کی۔ جنھوں نے چمڑے کا کام کرنے والوں کو جمع کیا اور ان کے سماجی مرتبے کو بہتر بنانے کے لیے ایک تحریک چلائی۔ مشرقی بنگال میں ہری داس ٹھاکر کے متوا فرقے نے چنڈال کاشت کاروں کے درمیان
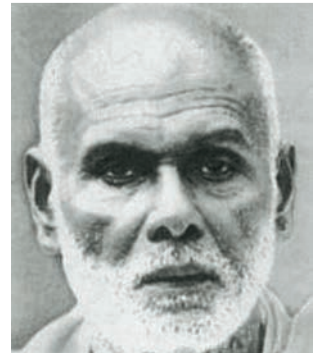
شکل 12 – شری نارائن گرو

کلاس روم کے اندر کوئی جگہ نہ تھی

بمبئی پریزیڈینسی میں 1829 تک بھی اچھوتوں کو سرکاری اسکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ جب ان لوگوں میں سے کچھ نے زور ڈالا تو ان کو کلاس روم سے باہر برآمدوں میں بیٹھنے اور سبق سننے کی اجازت ملی وہ بھی اس طرح کہ ان کے بیٹھنے سے وہ کمرے ''گندے'' نہ ہوں جہاں اعلیٰ ذات کے لڑکے بیٹھتے تھے۔

سرگرمی

1۔ تصور کیجیے کہ آپ ان طلبا میں سے ایک ہیں جن کو برآمدے میں بیٹھ کر سبق سننا پڑتا ہے۔ آپ کے دماغ میں کس قسم کے سوالات پیدا ہوں گے؟

2۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اچھوتوں کے لیے مکمل طور پر جاہل رہنے کے مقابلے میں یہ صورت بہتر تھی۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

2019-20

کام کیا۔ ہری داس نے ان برہمن گرنتھوں پر سوال اٹھائے جو ذات پات کی حمایت میں تھے۔ موجودہ کیرالا میں اژاوا (Ezhava) نامی ذات کے ایک گرو شری نارائن گرو نے اپنے لوگوں کے درمیان اتحاد کے آدرشوں کی تلقین کی۔ انھوں نے ایک ہی فرقے یا ذات کے تمام لوگوں کے درمیان مساوات کی تبلیغ کی۔ انھوں نے ذات پات کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان فرق کرنے کی مخالفت کی۔ ان کے نزدیک تمام انسانیت کی ایک ہی ذات ہے۔ ان کا ایک اہم قول تھا: ''اورو جاتی، اورو متم، اورو دیوم منشیانو'' (انسانیت کے لیے ایک ذات، ایک مذہب، ایک ایشور)۔

ان سب فرقوں کی بنیاد ایسے لوگوں نے ڈالی تھی جو غیر برہمن ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ایسی عادتیں اور ایسے کام بدلنے کی کوشش کی جن سے اعلیٰ ذات کے لوگوں کی نفرت بھڑکتی تھی۔ انھوں نے ادنیٰ ذات کے لوگوں میں عزت نفس کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔

غلام گیری

جیوتی راؤ پھولے نچلی ذات کے بہت پر جوش لیڈر تھے۔ یہ 1827 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے عیسائی مبلغین کے قائم کردہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ بڑے ہو کر ذات سماج کی ناانصافیوں کے بارے میں ان کے خیالات کی تشکیل ہوئی۔ انھوں نے برہمنوں کے اس دعوے پر تنقید کی کہ وہ چوں کہ آریہ ہیں اس لیے دوسروں سے افضل ہیں۔ پھولے کی دلیل یہ تھی کہ آریہ بھی غیر ملکی تھے جو اس برصغیر میں باہر سے آئے تھے اور انھوں نے یہاں کے ان اصلی باشندوں کو شکست دے کر اپنی رعایا بنا لیا تھا جو یہاں ان کی آمد سے پہلے سے

شکل **13** – جیوتی راؤ پھولے

ماخذ 3

پھولے نے اس نوآبادیات مخالف قومیت (Anti-Colonial Nationalism) کی سخت تنقید کی جس کی اعلیٰ ذات کے لیڈر تبلیغ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے:

برہمنوں نے اپنے مذہب کی تلوار کو چھپا رکھا ہے جس سے وہ لوگوں کی خوشحالی کا گلا کاٹتے ہیں اور اس پر اپنے کو اس ملک کا بڑا محبِّ وطن ظاہر کرتے ہیں۔ یہ لوگ...... ہمارے شودروں، مسلمانوں اور پارسی نوجوانوں کو...... یہ درس دیتے ہیں کہ جب تک ہم اپنے ملک میں اونچ نیچ، تقسیم اور جھگڑے سے نجات نہیں پالیں گے اور متحد نہیں ہو جائیں گے اس وقت تک ہمارا...... ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا...... اتحاد سے ان کے مقاصد پورے ہو جائیں گے اور تب میں پھر اپنی جگہ اور تم اپنی جگہ رہو گے۔

جیوتی باپھولے کاشت کار کا چابک

سرگرمی

ماخذ 3 کو غور سے پڑھیے۔ جیوتی راؤ پھولے کے اس جملے ''میں پھر اپنی جگہ اور تم اپنی جگہ'' کا کیا مطلب ہے؟

رہتے سہتے تھے۔ جب آریوں کا غلبہ ہوگیا تو انھوں نے مفتوح قوم کو کمتر اور نچلی ذات کا سمجھا۔ پھولے کے مطابق ''اعلیٰ'' ذاتوں کو ان کی زمین اور اقتدار پر کوئی حق نہ تھا: درحقیقت زمین یہاں کے دیسی لوگوں کی تھی جنھیں نام نہاد نچلی ذات کے لوگ کہا گیا۔

پھولے نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ آریوں کی حکومت سے پہلے ایک ایسا سنہری زمانہ تھا جس میں جنگجو— کسان زمین میں کاشتکاری کرتے تھے اور انصاف وایمانداری کے ساتھ مراٹھا دیہات پر حکومت کرتے تھے۔ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ شودر (مزدوری کرنے والی ذاتیں) اور اتی شودر (اچھوت) ذات پات کے امتیاز کے خلاف متحد ہو جائیں۔ پھولے نے ستیہ شودھک سماج نامی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ اس تنظیم نے اس بات کی تبلیغ کی کہ سب ذاتیں برابر ہیں۔

پھولے نے 1873 میں ''غلام گیری'' نامی ایک کتاب لکھی تھی۔ اس نام کا مطلب ہے غلام بنانا۔ اس سے کوئی دس سال پہلے امریکہ میں خانہ جنگی (Civil War) ہوئی تھی جس کے نتیجے میں امریکہ میں غلامی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ پھولے نے اپنی اس کتاب کو ان تمام امریکیوں کے نام منسوب کیا جنھوں نے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے جنگ کی تھی۔ اس طرح انھوں نے امریکہ کے کالے غلاموں اور ہندوستان کی نچلی ذاتوں کے حالات کے درمیان ایک تعلق پیدا کیا۔

جیسا کہ اوپر کی مثال سے ظاہر ہے پھولے نے ذات پات کے نظام پر تنقید کرتے ہوئے نابرابری کی تمام اقسام کی مخالفت کی ہے۔ اعلیٰ ذات کی خواتین کی حالت ہو یا مزدوروں کے دکھ درد یا پھر نچلی ذاتوں کی ذلت، پھولے سبھی کے لیے فکرمند تھے۔ ذات پات کی اصلاح کی یہ تحریک بیسویں صدی میں بھی جاری رہی اور ڈاکٹر بی آر امبیڈکر مغربی ہندوستان میں اور ای وی راما سوامی نائکر جنوبی ہندوستان میں اس تحریک کے روح رواں رہے۔

مندروں میں کون جا سکتا تھا؟

امبیڈکر ایک مہار خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں انھیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں ذات پات کے تعصّبات کا شکار ہونا پڑا۔ اسکول میں ان کو کلاس روم سے باہر زمین پر بیٹھنا پڑتا تھا اور انھیں ان نلوں سے پانی پینے کی اجازت نہیں تھی جن سے اعلیٰ ذات کے بچے پانی پیتے تھے۔ اسکول کی تعلیم پوری کرنے کے بعد انھیں امریکہ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے

لیے وظیفہ مل گیا۔ 1919 میں جب وہ واپس آئے تو انھوں نے اپنے معاصر سماج میں ''اعلیٰ'' ذات کی قوت کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔

1927 میں امبیڈکر نے مندروں میں داخلے کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک میں ان کی مَہار برادری کے لوگوں نے شرکت کی۔ جب دلتوں نے مندروں کے کنویں کا پانی استعمال کرنا شروع کیا تو برہمن مہنتوں کو بہت غصہ آیا۔

امبیڈکر نے 1927 سے 1935 تک مندروں میں داخلے کے لیے تین تحریکوں کی رہنمائی کی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ سماج کے اندر ذات پات کی بنیاد پر تعصّبات کی قوت کا اندازہ لگالیں۔

ماخذ 4

''ہم بھی انسان ہیں''

1927 میں امبیڈکر نے کہا تھا:

ہم کنویں تک صرف یہ ثابت کرنے کے لیے جانا چاہتے ہیں کہ دیگر لوگوں کی طرح ہم بھی انسان ہیں......ضرورت یہ ہے کہ ہندو سماج دو اصولوں کی بنیاد پر پہچانا جائے اور وہ ہیں ایک برابری اور دوسرے ذات پات کا نہ ہونا۔

غیر برہمن تحریک

بیسویں صدی کی ابتدا میں غیر برہمن تحریک شروع ہوئی۔ اس کی شروعات ان غیر برہمن ذاتوں نے کی جنھوں نے تعلیم حاصل کر لی تھی اور جن کے پاس دھن دولت تھی۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ برہمن شمال کے ان آریہ حملہ آوروں کے وارث ہیں جنھوں نے اس علاقے کے اصلی باشندوں - دیسی دراوڑی نسلوں - کی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان غیر برہمن ذاتوں نے برہمنوں کے اقتدار کو بھی چیلنج کیا۔

شکل 14 – مدورئی مندر کا دروازہ، ٹامس ڈینیل نے بنائی تصویر، 1792

جب تک مندروں میں داخلے کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی اس وقت تک اچھوتوں کو ایسے کسی دروازے پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

ای۔وی۔راما سوامی نائیکر جنھیں پیریار کہا جاتا تھا، کا تعلق ایک متوسط طبقے کے خاندان سے تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں ایک سنیاسی تھے اور انھوں نے بہت احتیاط سے سنسکرت کی مذہبی تحریروں کا مطالعہ کیا تھا۔ بعد میں وہ کانگریس کے ممبر ہو گئے لیکن کانگریس کی ممبری انھوں نے اس وقت چھوڑ دی جب قوم پرستوں کی ایک دعوت میں بیٹھنے کا انتظام ذات پات کی بنیاد پر کیا گیا یعنی اس طرح کہ نچلی ذات کے لوگ اونچی ذات کے لوگوں سے فاصلے پر بیٹھیں۔ جب پیریار کو یہ یقین ہو گیا کہ اچھوتوں کو اپنی عزت و وقار کی لڑائی خود لڑنی ہے تو انھوں نے ''تحریک خود احترامی'' (Self Respect Movement) کی بنیاد ڈالی اور بتایا کہ تمل اور دراوڑی کلچر کے اصل رکھوالے اچھوت ہیں جنھیں برہمنوں نے اپنی رعایا بنا لیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ تمام مذہبی رہنما سمجھتے ہیں کہ سماجی تقسیم اور نابرابری خدا کی طرف سے ہے چنانچہ اچھوتوں کو سماجی برابری حاصل کرنے کے لیے تمام مذاہب سے آزاد کرانا ہوگا۔

پیریار ہندو مذہبی کتابوں خاص طور پر منو کے قوانین، بھگوت گیتا اور راماین وغیرہ پر سخت اور کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نچلی ذاتوں پر برہمنوں کے اقتدار اور عورتوں پر مردوں کے تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے ان مذہبی کتابوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

ان دعووں اور خیالات کو چیلنج بھی کیا گیا۔ نچلی ذات کے رہنماؤں کی پُر جوش تقریروں، تحریروں اور تحریکوں نے اونچی ذات کے قومی رہنماؤں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی متعصب ہندو سماج نے اس کی مخالفت میں بھی ردِعمل ظاہر کیا اور شمال میں سناتن دھرم اور بھارت دھرم مہامنڈل کی بنیاد ڈالی اور بنگال میں برہمن سبھا جیسی تنظیمیں قائم کیں۔ ان تنظیموں کا مقصد ہندو مت کی بنیادوں میں ذات پات کے امتیاز کو برقرار رکھنا اور یہ دکھانا تھا کہ ذات پات کے نظام کا تقدس مذہبی صحیفوں سے ثابت ہے۔ ذات پات پر مباحثوں اور جدوجہد کا سلسلہ نوآبادیاتی دور کے بعد بھی جاری رہا اور آج ہمارے زمانے میں بھی جاری ہے۔

شکل **15**–ای۔وی۔راما سوامی نائیکر (پیریار)

ماخذ 5

پیریار بنام خواتین

پیریار نے لکھا:

صرف ''تارا مکرتم'' جیسے الفاظ کے عام ہونے سے عورتیں اپنے شوہروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئی ہیں۔ وہ باپ جو اپنی بیٹیوں سے یہ کہتے ہیں کہ تم اپنے شوہروں کو تحفے میں دی جا رہی ہو اور تمہارا تعلق شوہر کے گھر سے ہے، ہم ان سے تعلق توڑتے ہیں...... یہ نتیجہ ہے سنسکرت کے ساتھ ہماری وابستگی کا۔

پیریار، پیریار چنتا نائیکل میں شائع

سرگرمی

آج بھی ذات پات ایک متنازعہ موضوع کیوں ہے؟ آپ کے خیال میں نوآبادیاتی دور میں ذات پات کے خلاف سب سے اہم تحریک کون سی تھی؟

2019-20

اصلاح کی تنظیمیں

شکل 16– کیشب چندر سین یہ برہمو سماج کے اہم رہنماؤں میں سے تھے۔

برہموسماج

برہموسماج کی بنیاد 1830 میں پڑی۔ یہ سماج مورتی پوجا اور قربانی کی تمام صورتوں کا مخالف تھا، اپنشدوں پر یقین رکھتا تھا اور اپنے ممبران کو کسی بھی مذہبی رسوم پر تنقید کرنے سے منع کرتا تھا۔ یہ سماج مذاہب— خاص طور پر ہندو مت اور عیسائیت —کے آدرشوں کا مطالعہ تنقیدی نگاہ سے کرتا تھا اور ان کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو دیکھتا تھا۔

ڈی روزیو اور اس کی ینگ بنگال تحریک

شکل 17 – ہنری ڈی روزیو

ہنری لوئس ویویان ڈی روزیو (Henry Louis vivian Derozio) 1820 کی دہائی میں کلکتے کے ہندو کالج میں ٹیچر تھے۔ ان کے خیالات انتہا پسندانہ تھے اور وہ اپنے شاگردوں کو بھی اس بات کے لیے آمادہ کرتے تھے کہ وہ ہر صاحبِ اختیار پر سوال اٹھا سکیں۔ ان کی تنظیم ''ینگ بنگال موومنٹ'' کے طلبا نے رسوم وروایات کو تنقید کا نشانہ بنایا، عورتوں کے لیے تعلیم کا مطالبہ کیا اور تقریر وتحریر کی آزادی کی مہم چلائی۔

رام کرشن مشن اور وویکانند

شکل 18– سوامی وویکانند

اس مشن کا نام، سوامی وویکانند کے گرو رام کرشن پرم ہنس کے نام پر پڑا۔ یہ مشن سماجی خدمت اور اخلاصِ عمل کے ذریعے نجات پر زور دیتا تھا۔

پرارتھنا سماج

پرارتھنا سماج کا قیام بمبئی میں 1867 میں ہوا۔ یہ سماج ذات پات کی پابندیوں اور کم عمری میں شادی کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ عورتوں کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتا تھا اور بیوہ عورتوں کی شادی پر پابندی ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس سماج کے مذہبی جلسوں میں ہندو، بودھ اور عیسائیوں کے مذہبی صحیفوں پر بحث ہوتی تھی۔

شکل 19– سرسید احمد خان
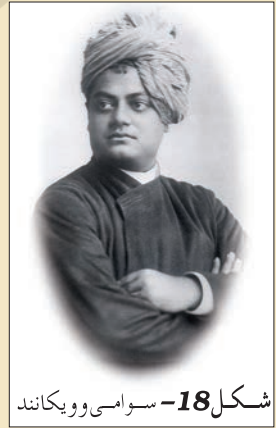
وید سماج

وید سماج مدراس (چینئی) میں 1864 میں قائم ہوا۔ یہ برہموسماج سے متاثر تھا۔ اس نے ذات پات کے خاتمے کے لیے کام کیا اور بیواؤں کی شادی اور عورتوں کی تعلیم کی پُرزور حمایت کی۔ اس کے ممبر ایک خدا پر یقین رکھتے تھے کٹر پنتھی ہندو مت کے توہمات اور مذہبی رسومات کی مذمت کرتے تھے۔

علی گڑھ تحریک

سید احمد خاں نے علی گڑھ میں 1875 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، قائم کیا جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

2019-20
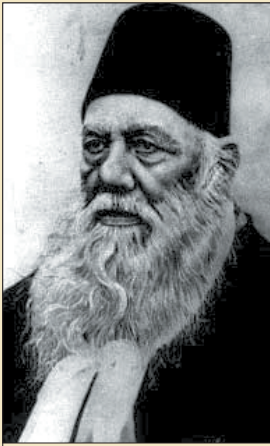
بنا۔اس ادارے میں مسلمانوں کے لیے مغربی سائنس اور جدید تعلیم کا انتظام کیا گیا۔جیسا کہ معلوم ہے کہ علی گڑھ تحریک نے تعلیمی اصلاحات کے میدان میں غیر معمولی اثرات چھوڑے۔

شکل **20** – امرتسر کا خالصہ کالج، اسے سنگھ سبھا تحریک کے رہنماؤں نے 1892 میں قائم کیا

سِنگھ سبھا تحریک

سنگھ سبھائیں سکھوں کی پہلی اصلاحی تنظیمیں تھیں۔ یہ 1873 میں امرتسر میں اور 1879 میں لاہور میں قائم ہوئیں۔ ان سبھاؤں کا مقصد سکھوں کو توہمات، ذات پات اور غیر سکھ رسوم ورواج سے بچانا تھا۔ان تنظیموں نے سکھوں میں تعلیم کو فروغ دیا اور بیش تر جدید تعلیم اور سکھ تعلیمات کو یکجا کر دیا۔

دوسرے مقام پر

سیاہ فام غلام اور سفید فام باغان مالک

آپ پڑھ چکے ہیں کہ جیوتی راؤ پھولے نے اپنی کتاب 'غلام گیری' میں ذات پات کی سختیوں اور امریکہ میں غلامی کے کاموں کے درمیان کس طرح ایک تعلق پیدا کیا۔غلامی کا یہ نظام کیا تھا؟

سترھویں صدی میں جب یورپ کے تاجر اور دنیا کی تلاش میں نکلنے والے لوگ افریقہ پہنچے تو اسی وقت سے غلاموں کی تجارت شروع ہوگئی، کالے لوگوں کو پکڑا گیا اور ان کو افریقہ سے امریکہ لایا گیا۔اور وہاں سفید فام باغان مالکوں کے ہاتھوں فروخت کیا گیا۔ یہاں ان کو کپاس اور دیگر چیزوں کے کھیتوں پر کام کرنا پڑا۔ یہ باغان بیشتر امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں تھے۔ان باغان میں صبح سے شام تک ان لوگوں کو کام کرنا پڑتا تھا۔کام ادھورا رہ جاتا یا ٹھیک نہ ہوتا تو سزا ملتی، کوڑے کھانے پڑتے یا کسی اور قسم کی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا۔

شکل **21** – غلاموں کی خریدوفروخت ،جنوبی کارولینا، امریکہ، 1856

اس تصویر میں آپ کو وہ خریدار نظر آرہے ہیں جو نیلامی میں غلاموں کو ٹھونک بجا کر دیکھ رہے ہیں۔

گورے اور کالے بہت سے لوگوں نے منظم مظاہروں کے ذریعے اس غلامی نظام کی مخالفت کی۔غلامی نظام کی مخالفت کے دوران انھوں نے 1776 کے امریکی انقلاب کی دہائی دی اور کہا ''اے امریکیو! اپنے انقلاب کے منشور پر نظر ڈالو۔تم اپنی زبان تو سمجھتے ہو؟ ابراہم لنکن نے اپنی گیٹس برگ (Gettysburg) کی پُر اثر تقریر میں کہا تھا کہ جن لوگوں نے غلامی کے خلاف جنگ کی تھی انھوں نے دراصل آزادی کے حصول کے لیے جنگ کی تھی۔انھوں نے لوگوں سے نسلی برابری کے لیے جدوجہد کرنے کو کہا تاکہ ''عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے'' روئے زمین سے ختم نہ ہونے پائے۔

تصور کیجیے

تصور کیجیے کہ آپ رقیہ حسین کے قائم کردہ اسکول میں ایک ٹیچر ہیں۔ 20 لڑکیاں آپ کی نگرانی میں ہیں۔ اسکول میں کسی دن منعقد ہونے والے کسی مباحثے کا بیان کیجیے۔

دوھرائیے

1۔ مندرجہ ذیل لوگوں نے کن سماجی نظریات کی حمایت کی۔

رام موہن رائے

دیانند سرسوتی

ویریسالنگم پنتولو

جیوتی راؤ پھولے

پنڈتا رامابائی

پیریار

ممتاز علی

ایشور چندر ودیا ساگر

2۔ بتائیے کہ یہ بیانات صحیح ہیں یا غلط:

(a) جب انگریزوں نے بنگال پر قبضہ کرلیا تو انھوں نے شادی، تبنیت (گود لینا) جائداد کی وراثت وغیرہ کے بارے میں بہت سے نئے قانون بنائے۔

(b) سماجی معاملات میں اصلاحات کرنے کے لیے سماجی مصلحین کو قدیم مذہبی کتابیں مسترد کرنی پڑیں۔

(c) سماجی مصلحین کو ملک کے تمام طبقات کے لوگوں کی حمایت حاصل تھی۔

(d) کم عمری شادی پابندی ایکٹ (Child Marriage Restraint Act) 1829 میں پاس ہوا۔

گفتگو کیجیے

3۔ نئے قوانین کے فروغ میں قدیم مذہبی کتابوں کے علم نے مصلحین کی کیا مدد کی؟

4۔ لڑکیوں کو اسکول نہ بھیجنے کے لیے لوگ کیا کیا دلائل دیتے تھے؟

5۔ ملک میں بہت سے لوگوں نے عیسائی مشنریوں پر حملے کیوں کیے؟ کیا دیگر لوگوں نے ان کی حمایت کی؟ اگر کی تو کس بنیاد پر؟

6۔ برطانوی دورِ حکومت میں وہ کون سے نئے مواقع تھے جو ''نچلی'' سمجھی جانے والی ذاتوں کو حاصل ہوئے؟

7۔ سماجی مصلح جیوتی راؤ نے سماج میں ذات پات اور نابرابری پر تنقید کے کیا دلائل دیے؟

8۔ پھولے نے اپنی کتاب غلام گیری کو اس امریکی تحریک کے نام کیوں منسوب کیا جو غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے تھی؟

9۔ مندر میں جانے کی جو تحریک امبیڈکر نے شروع کی تھی اس کا کیا مقصد تھا؟

10۔ جیوتی راؤ پھولے اور راما سوامی نایکر قومی تحریک پر کیوں تنقید کرتے تھے؟ کیا ان کی تنقید سے کسی طرح قومی جدوجہد کو کچھ فائدہ بھی پہنچا؟